بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پاکستان کا دوسرا اور دنیا کا پانچ سو پچپنواں (۵۵۵) ریفرنڈم ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو بخیر و خوبی منعقد ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ عوام واضح مثبت نتیجے پر پہنچے

جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو تو ہر جانب سے مبارکبادیں پہنچ رہی ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اصل مبارک خود پاکستان کے لیے ہے جس کی فلاح و بہبود کی راہ کھلی۔ بعد ازاں تہنیت اس کے شہریوں کے لیے ہے جنہوں نے ۱۹۴۶ء والے جذبے کی یاد تازہ کرا دی۔

میں اپنے ان قریبی ہمسفرانِ مقصد سے بے حد متاثر ہوں جنہوں نے اجتماعیت کے فیصلے کے مقابلے میں ذاتی آرا و جذبات کو درکنار رکھ کر نہ صرف ریفرنڈم میں ووٹ دیئے بلکہ تگ و دو بھی کی۔ نظامِ سمع و طاعت کے پابند یہی لوگ ہمارا اصل سرمایہ ہیں۔ اور انہی پر خدا کے بعد بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ راہِ حق میں ہماری قوت ہیں۔ میں آخرت میں بھی ان کے حق میں گواہی دوں گا کہ انہوں نے اجتماعیت کے احترام اور سربراہ کی اطاعت کا حق ادا کر دیا۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ ان کو دنیا و آخرت میں بہترین جزا دے اور شہداء حق کی صف میں شامل کرے۔ جس کسی سے کوتاہی ہوئی ہو وہ خدا سے بعجز عفو طلبی کرے۔ اجتماعیت سے انحراف اور سربراہ کی اطاعت سے روگردانی شرعی طور پر گناہ ہے۔

مجھے ریفرنڈم کے اعلان پر چند پہلوؤں سے اُلجھن رہی، مثلاً یہ ریفرنڈم ہونا چاہیے تھا یا نہیں؟ اب ہونا چاہیے تھا یا اب سے بہت پہلے؟ اس کے سوال کا انداز کیا ہونا چاہیے تھا؟ آیا نظریہ پاکستان اور حکومت کے نفاذِ اسلام، قوانین کو کتاب و سنت میں ڈھالنے کی مساعی، اقدامات کے متعلق الگ اور جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی ۵ سالہ صدارت کے لیے الگ، دو ریفرنڈم ہونے چاہئیں تھے؟ وغیرہ!

مگر احباب سے تبادلۂ خیالات کرنے اور ان کے دلائل سامنے آنے کے بعد، نیز ریفرنڈم کے سوال کا قانونی تجزیہ ہونے کے بعد ذہن آہستہ آہستہ یکسو ہو گیا اور پھر جب ہمسفرانِ جادۂ حق کا اجتماعی زاویۂ نگاہ نتھر کر سامنے آگیا تو چمکتے ہوئے چہروں نے مجھے بھی اطمینان کی روشنی دی۔ دل ٹھک گیا کہ اس ریفرنڈم کو مثبت طور پر کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہیے۔ اور ہم سب کو اس میں امکانی حد تک ہر جائز طریقہ سے حصہ لینا چاہیے۔ الحمدللہ کہ میرا دل احباب کے کاروان کے لیے اور میرا کارواں کے لیے وفادار ہے۔ میں نے اپنی اہلیہ اور بیٹے سمیت ۵، ۶ میل کی دوری پر جا کر اپنے ووٹ ڈلوائے اور دلی مسرت ہوئی کہ میں نے اپنا فرض خلوص سے ادا کیا۔ مجھے افسوس ہے اس بات کا کہ علالت و ناتوانی کی وجہ سے مزید سرگرمی جو میدانِ عمل میں دکھائی جانی چاہیے، اس میں کوتاہ رہا۔ خدا اس کوتاہی کو معاف فرمائے۔

اس ریفرنڈم کی اہمیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب عرض کرتا ہوں۔

پہلی اہمیت یہ ہے کہ مارشل لا کے تسلط سے نکل کر قوم کو سول جمہوری اور انتخابی حکومت کے دائرے میں داخل ہونے کا راستہ مل گیا ہے۔ انتخابات کو مؤخر کرنے کا اندیشہ اب اس وجہ سے نہیں ہے کہ صدرِ پاکستان کے آئندہ پانچ سالہ صدارت کا آغاز ہی منتخب ایوانوں کے اجلاس سے ہونا ہے۔ یہ واضح طور پر انتخابی گارنٹی ہے۔

دوسری اہمیت یہ ہے کہ اب تک جو کچھ کام ہوا تھا، نہ صرف اس کو عوامی ووٹوں

نے تحفظ فراہم کر دیا ہے بلکہ آئندہ ہونے والے انتخابات اور ان کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلیاں، ان سب کو آئینی ضمانت مل گئی ہے۔ اگر ایسی ضمانت کے بغیر انتخابات کرائے جاتے تو کل کوئی بھی شخص عدالت کے سامنے جا کر ان کو چیلنج کر سکتا تھا، پھر اگر یہ سارا عمل خلاف آئین قرار پاتا تو قوم ایک غیر محدود اتھاہ تاریکی میں کھو جاتی۔ ریفرنڈم کے مثبت نتیجے نے ان خطرات کی راہ بند کر دی ہے۔

تیسری اہمیت یہ ہے کہ اس ریفرنڈم نے لادینیت پسندوں اور تخریب پسندوں کے اس محاذ کو شکست دے دی ہے جو موجودہ حکومت کے خلاف تو تھے ہی، ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ آگے کے لیے جمہوریت کی بحالی اور انتخابات کے انعقاد کا راستہ روکا جائے تاکہ نئے مارشل لا کا انعقاد عمل میں آجائے۔ اور پھر وہ اس کی رکاب تھام کر اپنا اُلو سیدھا کر سکیں۔

چوتھی اہمیت یہ کہ نظریہ پاکستان اور نفاذ اسلام کا جو سرمایہ تحریک پاکستان نے قوم کے لیے چھوڑا تھا، اُس میں اِسی قوم کے سیکولرسٹ لیڈروں نے یہ کہہ کر کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے تھے کہ پاکستان کا تو مقصدِ وجود محض سیاسی و اقتصادی آزادی تھا، اس کا کوئی تعلق اسلامی قانون و حکومت سے نہ تھا۔ اس کے لیے وہ یہ کہتے رہے کہ قائداعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی (دستوریہ میں) تقریر اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ خود قائداعظم کا منشا لادینی نظام تھا۔ انہیں یہ خیال نہ آیا کہ وہ قائداعظم پر نہ صرف تناقض کا، بلکہ موقع پرستی کا ناپاک الزام بھی تھوپ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے مقبولِ عام نعرے "پاکستان کا مطلب کیا ـــ لا الٰہ الا اللہ" کی شانِ نزول یہ بیان کی کہ وہ تو بچوں کا نعرہ تھا۔ اِس سرپھرے پن کا جواب اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ نظریۂ پاکستان اور نفاذ اسلام کے حق میں از سر نو بالغ شہریوں کے ووٹ ڈلوا کر دکھا دیا جائے کہ یہ نعرہ آج بھی بزرگوں، نوجوانوں اور خواتین کا دل پسند نعرہ ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء کے قومی رجحانات کو قوم کے ذریعے تازہ کرا کے ایسے حضرات کے سامنے رکھ دیا گیا۔ آج ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے کہ اصل بچے خود یہ بزرگ ہیں جنہوں

نے محض فاصلۂ وقت سے فائدہ اٹھا کر خلافِ حقیقت باتیں کہیں اور ساری قوم کو بچوں کا انبوہ سمجھ کر انہیں پھسلانا چاہا۔

سچ یہ ہے کہ کمیونسٹوں، لادینیت پسندوں اور تخریب کیشوں کی کمر اس فیصلے سے ٹوٹ گئی ہے۔

پانچویں اہمیت یہ ہے کہ روسی بھارتی لابی اور ان کے جاسوسی نظاموں اور آلہ ہائے کار کے خواب کرچی کرچی ہو گئے ہیں۔ اگر یہ ریفرنڈم نہ ہوتا تو روس اور بھارت دونوں کی خفیہ سرگرمیاں ہمارے ہاں کے آنے والے انتخابات کے خلاف شروع ہو جاتیں (جب کہ بھارت اپنے انتخابات سے فارغ ہو کر نئی قوت کے ساتھ پاکستان پر اپنی پرچھائیں ڈالنے کے لیے مصروفِ عمل ہو جاتا)۔

چھٹی اہمیت یہ ہے کہ آج ریفرنڈم نے پاکستانی قوت کے اسلامی جذبے اور وحدت کی قوتوں کو مجتمع کر کے پاکستان کو اس قابل کر دیا ہے کہ وہ اپنی داخلی اور خارجہ پالیسیوں کو آگے بڑھانے کے لیے مضبوطی سے کام کر سکے اور دنیا کی ہر قوت کے سامنے اعتماد سے کھڑا ہو سکے۔ نیز سرحدوں پر جو خطرات منڈلا رہے ہیں ان کو بھی اب ملحوظ رکھنا ہو گا کہ سامنے ایک ایسی قوت ہے جسے عوام کے ووٹوں نے اعتماد کی قوت دے چٹان بنا دیا ہے۔

ساتویں اہمیت یہ ہے کہ ریفرنڈم جس سوال پر ہوا ہے اس میں قانونی طور پر دو باتیں طے ہو گئیں۔ اوّل یہ کہ صدر کی ذمہ داری ہے کہ وہ قوانین کو کتاب وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کا کام تیز تر کرے۔ اور دوم یہ کہ انتخابات کا انعقاد کرائے۔ اب اگر صدر اسلامی قانون سازی نہ کرے یا اس میں تاخیر و التوا سے کام لے یا قانون سازی میں کتاب وسنت کے اسلام سے انحراف کرے تو معاملہ عدالت کے سامنے لے جایا جا سکتا ہے کہ قوم نے ۵ سالہ صدارت جس متعین مقصد کے لیے دی تھی اسے صحیح طور پر پورا نہیں کیا جا رہا۔ اسی طرح اگر انتخابات کے انعقاد کرنے میں بے جا تاخیر ہوا (جو بظاہر اس لیے ممکن نہیں کہ صدر کی صدارت کا آغاز ہی انتخابات کے بغیر نہیں ہو سکتا) تو یہ معاملہ بھی عدالت

میں لے جایا جاسکتا ہے کہ شہریوں نے تو ووٹ جلد انتخابات کرانے کے لیے دیئے ہیں مارشل لا کے فیصلوں کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا، مگر اب ریفرنڈم کا سوال ایک عوامی، سیاسی اور قانونی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس کے مضمرات پر عدالتوں میں بحث ہوسکتی ہے۔

جذباتی طور پر سوچنے والے حضرات ٹھنڈے دل سے ریفرنڈم کی ان اہمیتوں پر غور کریں۔ سیاست جذباتی ہیجانات سے نہیں چلا کرتی، سیاست کے لیے فراست و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

کچھ لیڈروں اور شہریوں کی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذہنوں کی ساخت ایسی بنالی ہے کہ اور سب کچھ گوارا ہے، مگر جنرل محمد ضیاء الحق کا وجود کسی طرح گوارا نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ پہلے تو آپ غلام محمد گورنر جنرل، سکندر مرزا، صدر ایوب، یحییٰ خاں، بھٹو اور مجیب سب کے ساتھ جنرل محمد ضیاء الحق کو ایک قطار میں کھڑا کریں اور سب کو ان کے خیالات، کردار اور کارکردگی کے لحاظ سے نمبر دیں اور پھر بتائیں کہ آپ کس نتیجے تک پہنچتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ جنرل ضیاء الحق کو "۵" نمبر دیتے ہیں۔ اور اس لیے آپ نے ریفرنڈم کی مخالفت کی ہوگی یا بائیکاٹ کیا ہوگا۔ ذرا یہ فرمائیے کہ اگر ریفرنڈم کا نتیجہ خدانخواستہ اُلٹا ہوتا تو پھر کونسا ابراہیم لنکن یا امیرالمؤمنین یا آفتابِ تقویٰ سامنے آجاتا۔ پھر تو صدر ضیاء الحق بوریا بستر لپیٹتے اور کوئی دوسرا جنرل آچکا ہوتا اور وہ اب سے نئے اور نوجوان مارشل لا کو کسی اور ڈھب سے لے کے چلتا جسے سمجھنے اور جس کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے سے پہلے جسے "بھگتنا" بھی ہوتا اور ممکن ہے کہ اس پہلو سے تجربہ سابق تجربوں سے زیادہ تلخ ہوتا۔

اور فرض کیجیے کہ اہلِ سیاست کو پکارا جاتا کہ صاحبان آیئے اور نظام کو سنبھالیے۔ تب ذرا یہ فرمایئے کہ کیا دس بارہ یا زیادہ سیاسی (نیز دینی) افراد میں سمجھوتہ ہو بھی سکتا تھا؟ (چند سال کے تجربے کو سامنے رکھیے!) اور ہوتا تو کس شخصیت پر ہوتا۔ میں کسی کا نام نہیں لیتا۔ کیونکہ اس سے خواہ مخواہ کا ردّ عمل پیدا ہوسکتا ہے۔ آپ سارے بڑے ناموں کی فہرست بنایئے اور غور کیجیے کہ کس پر سمجھوتہ ہوسکتا تھا۔ اور پھر اس سے آپ کو دینی اور ملکی لحاظ سے کیا ملتا؟

یہ کوئی سیاست نہیں ہے کہ ایک شخص کو آپ میخ بناکر ذہن میں گاڑ لیں اور یہ کہیں کہ جب تک یہ میخ نہیں نکلتی، نہ ہم انتخاب لڑیں گے اور نہ قوم یا ووٹروں کے کسی فیصلے کو قبول کریں گے۔ بائیکاٹ کسی خاص موقع پر کسی جلسے یا تقریب یا کانفرنس کا ہوسکتا ہے، لیکن اگر خود بائیکاٹ ہی ایک مسلک بن جائے تو پھر آپ سیاست کا کوچہ چھوڑ کر کوئی دوسرا بازار ڈھونڈیے۔ بائیکاٹ منفی راستہ ہے، سیاست میں منفی راستے پر زیادہ دُور تک نہیں چلا جاسکتا۔ منفیت دوسروں کو تو ختم کرے یا نہیں، خود اپنی قوتوں کو چاٹ جاتی ہے۔

کیا رحم طلب ہیں وہ سیاسی شخصیتیں اور گروہ جو ریفرنڈم سے پہلے بھی دل کا غبار نکالتے رہے اور جب اُن کے روکے ریفرنڈم کی گاڑی نہ رُکی تو انھوں نے سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر کو پیٹنا شروع کردیا۔ اخباروں کے کالموں اور نجی گفتگوؤں اور اخباری بیانوں میں ــــ یہاں سے لے کر بی بی سی، آکاش وانی اور ماسکو ریڈیو تک ــــ جابجا لکیر کو پیٹا جارہا ہے۔ جو حضرات پولنگ اسٹیشنوں پہ اُلّو بولنے کی پیش گوئی کررہے تھے، انھوں نے جب سیکڑوں جگہ پاکستانی شاہبازوں کی صفیں بنی دیکھیں تو ان کے اپنے دل و دماغ میں اُلّو بولنے لگا۔ آج کوئی کہتا ہے کہ پولنگ ۱۵، ۲۰ ٪ ہوئی اور کسی کا نتیجہ بتاتا ہے کہ ۵ ٪ ہوئی۔ دوسرا بتاتا ہے کہ جعلی ووٹ بے تحاشا بھگتائے گئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ ریفرنڈم کو ناکام بنانا چاہتے تھے تو شہری ذمہ داریوں کے

نخست جرأت کر کے آپ نے اپنے لوگوں سمیت جا کر "نہیں" کا ووٹ کیوں نہ ڈالا؟ اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا۔

آج جو لوگ بجبر مجبر کر کے ریفرنڈم کے مثبت نتیجے کے دودھ میں مینگنیاں ڈال رہے ہیں، انہیں اس شغل فضول کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نیک کام کرنا چاہیے۔

یہ طریقہ ملک کے سیاسی مزاج کو بگاڑنے والا ہے کہ پہلے آپ یہ زور لگائیں کہ ریفرنڈم نہ کرایا جائے۔ پھر آپ بائیکاٹ کر کے پولنگ اسٹیشنوں پر آلو بولوانا چاہیں، پھر جب سب کچھ ہو جائے تو فرمائیں کہ ہم نہیں مانتے۔

"میں نہ مانوں" کا اگر یہی طور سیاست کی ادا ٹھہرے تو جو کام آپ کرنا چاہیں اور اپنے گروہوں کو جن مقاصد سے بلائیں اور پبلک سے جو اپیل کریں اس پر منعقد لوگ "میں نہ مانوں" کہہ کر سامان انتشار کیوں نہ کریں؟ "میں نہ مانوں" کا راستہ انتشار کا راستہ ہے۔ آخر معاملات کو کسی نہ کسی طریقے سے، کسی نہ کسی نقطے پر آ کر ختم ہونا ہوتا ہے۔ جس ملک و قوم میں نزاعات کا کوئی اختتام نہ ہو، اس کے مقدر میں خرابی کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔

اب پیچھے پلٹنے یا بیٹھ رہنے کے بجائے اگلے مرحلے پر سوچ بچار کرنی چاہیے۔ اگلا مرحلہ انتخابات کا ہے۔

کچھ لوگ تو وہ ہیں جنھوں نے طے کر رکھا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں اگر انتخابات ہوں تو وہ ان میں شریک نہیں ہوں گے۔ ان [illegible] ایسی ہے جیسی ہمارے دیہی علاقوں [illegible] ہے [illegible] خدا سے [illegible] ٹیک کر ناراض ہوں، لیکن اگر [illegible] کہ خدا [illegible] بات نہیں [illegible] نعوذ باللہ۔ پس ان [illegible] [illegible] صاحب معتقد [illegible] دماغوں سے آراستہ شہری ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے انتخابات کے سلسلے میں میاں طفیل محمد صاحب کی پیش کردہ شرائط پر جو وضاحتیں اور یقین دہانیاں دوران ملاقات کرائی تھیں اور پھر جن کو پریس اور اسٹیج کے ذریعے بھی عوام کے سامنے رکھ دیا، ان کے متعلق مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ وہ اپنے ایک ایک لفظ کا پاس کریں گے، اور نہ کریں گے تو پھر ہم کو معلوم ہے کہ ہمارا فرض کیا ہے اور اسے ہمیں کس اسلوب سے ادا کرنا ہے۔ لیکن بلاوجہ مخالفانہ پیش قیاسیاں کرنے کی وجہ سے فضا خراب ہوتی ہے۔

اب اگر دستور منسوخہ کو برقرار رکھ کر، معقول طریق سے انتخابات کرا دیے جاتے ہیں اور پارلیمان کو بااختیار ادارہ بنایا جاتا ہے، وزیر اعظم کو بااختیار حیثیت دی جاتی ہے، نیز سویلین سے طے شدہ حقوق و اختیارات کو برقرار رکھا جاتا ہے اور مزید یہ کہ قرارداد مقاصد کو دستور کے دیباچے کے بجائے اس کا عملی حصہ بنا کر قوانین اسلام کے اجرا اور اسلامی اداروں کے قیام اور ان کے نشوونما اور پالیسیوں کو اسلامی اصول و مقاصد کے مطابق ڈھالنے کے تیز رفتار عمل کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے تو پہلے سے شکوک و شبہات سے بات کا آغاز نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ متذکرہ اعلانات و مواعید کو خوش آئند قرار دے کر عوام کو متحرک کرنا چاہیے۔

خاص طور پر جن لوگوں کو جمہوریت کی بحالی کے ساتھ دین کے لیے کام کرنا ہے، ان کو پیش آمدہ فرائض کے لیے آج سے عملی سرگرمی کی راہ پر گامزن ہو جانا چاہیے، بلکہ صحیح الفکر وہ لوگ نکلے جنہوں نے ریفرنڈم میں پبلک اور پولنگ کے عملے کے درمیان کام کر کے انتخابات کی راہ پر قدم آگے بڑھا دیا ہے۔

لہ یہ بہتر تصور یہی تھا کہ ریفرنڈم میں جو کارکن ووٹروں کو صحیح تلقین کریں، یا ان کی رہنمائی اور مدد کریں، یا پولنگ اسٹیشنوں پر ... کریں وہ ضیاء الحق کے کارکن بن گئے۔ وہی بات کہ بعض ذہنوں میں ضیاء الحق حمایتی بن کر رہ گیا ہے، صحیح نہیں۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

امین و ذہین قسم کے لیڈروں اور شہریوں کی خواہش اور کوشش یہی ہونی چاہیے کہ انتخابات اسی اعلان شدہ نقشے کے مطابق منعقد ہوں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

مگر فرض کیجیے جو معیاری تصور آپ کا ہے اس میں کوئی کسر رہ جائے تو یہ سوال جواب مانگتا ہے کہ پھر کیا کیا جائے۔ اس کا ایک آسان جواب تو ہے کہ مخالفت (بلا تصادم) کے ساتھ بائیکاٹ۔ مگر یہ جواب درست نہیں ہے۔

اگر برسرِ اقتدار قوت اپنی بات سے انحراف کرے یا شہریوں کی خواہشات یا اسلامی اور جمہوری روایات سے روگردانی کرے تو سخت اعتراض بھی کیجیے اور غلط روش کے خلاف احتجاج کی آواز بھی اٹھائیے۔ (اگر ممکن ہو!) لیکن ایسا بائیکاٹ بہت بے معنی ہے جو کسی فرد یا گروہ کے سیاسی اقدام کو برسوں کے لیے معطل کر دے، یہاں تک کہ اس کا سیاسی شعور اور سیاسی مزاج ہی دم توڑ دے۔

سیاست کا ایک اصول یہ ہے کہ سیاست کاری کسی درپیش صورتِ حال GIVEN CIRCUMSTANCES کو موجود مان کر اپنے عمل کو جاری رکھنے کا نام ہے۔ فرض کیجیے کہ مسافرِ سیاست کے سامنے ایک طویل و عریض جنگل آجاتا ہے اور وہ اسے دیکھ کر کہتا ہے کہ جب تک یہ جنگل کٹے گا نہیں اور صاف ہموار میدان نہ بن جائے گا، میں قدم آگے نہ بڑھاؤں گا۔ پھر وہ اطمینان سے کھیت میں اپنا کیمپ لگا لیتا ہے۔ یہ سیاسی طرزِ عمل نہیں ہے۔ سیاسی طرزِ عمل یہ ہے کہ اگر جنگل سامنے آجائے تو ہمیں اس میں سے اپنا راستہ نکالنا ہے، کسی بیل کو نوچ کر، کسی شاخ کو توڑ کر، کسی جھاڑی کو الانگ کر، کسی نالے پر پڑی سی سوکھی لکڑی سے پل بنا کر، سیدھا نہیں تو ذرا ادھر ادھر گھوم کر، ہجوم کر کے نہیں تو ایک قطار بنا کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

وہ اپنے مقصد کے کارکن بنے اور انہوں نے اپنے مقصد کے لیے انتخابی راستے میں پیش قدمی کی جنہوں نے کوتاہی کی، اب جب وہ لیکایک اپنے لیے ووٹ مانگنے جائیں گے تو ان کو خود محسوس ہو جائے گا کہ انہوں نے ریفرنڈم کے مرحلے کا کام نہ کر کے اپنا نقصان کیا۔

جنگل کا سینہ چیر جاتا ہے۔

یہی اُصول تھا جس کے تحت خان لیاقت علی خان مرحوم کے دور کے اُن انتخابات میں ہم نے حصّہ لیا جن میں سرکاری ملازمین پہلی بار زور شور سے استعمال ہوئے اور دھن، دھونس اور دھاندلی کے مختلف طریقے استعمال کیے گئے۔ پھر ایوب خان صاحب کی بنیادی جمہوریت جس کی شدید مخالفت مولانا مودودیؒ اور ان کے متاثرین نے کی، (اور اس دور میں زیادتیاں بھی برداشت کیں) اسی کے تحت ہونے والے انتخابات میں مولانا مودودیؒ کی رضامندی (بلکہ تقاضے سے) بہت سے محبانِ دین و جمہوریت نے پوری طرح حصّہ لیا[1] جن میں سے ایک مَیں بھی تھا۔ پھر یحییٰ خان کے مارشل لا کے تحت اور بعد ازاں بھٹو آمریت کے تحت ہونے والے انتخابات میں بھی ہم شریک ہوئے۔ بعد ازاں موجودہ مارشل لا کے تحت بلدیاتی انتخابات میں بھی ہمارے دوست بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور بہت سے کامیاب ہوئے۔

یہ سب کچھ اگر جائز تھا، تو آج جو انتخابات درپیش ہیں، ان میں اگر کوئی کمی بیشی رہتی بھی ہے تو اس کے باوجود ہمیں تو یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کس طرح اپنا راستہ بنا کر نقشۂ سیاست میں بہتر تبدیلی کی کوشش کر سکتے ہیں اور غلبۂ دین کے لیے کس حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

---

(۲)

کوئی بھی اجتماعیت اس حقیقت کو نظر انداز کر کے قائم نہیں کی جا سکتی، چاہے وہ مسجد کمیٹی ہو یا پارلیمنٹ، یا ریاست کہ افرادِ انسانی میں مختلف مسائل و معاملات کے

---

[1] صدارتی الیکشن ہوا تو اس میں بھی ہم نے حصّہ لیا۔